پروفیسر عبدالمجید صدیقی

آصف جاہی خاندان کی چند روایات

1 دکن میں آصف جاہی سلطنت کی تاسیس تاریخ ہند کا ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تاریخ عالم کے ساتھ تاریخ ہند نے بھی بہتیری کروٹیں بدلیں اور ہر کروٹ میں کوئی نہ کوئی انقلاب ضرور ہوا۔ اخلاق اور افکار کے نئے سانچے پیدا ہوئے۔ بعض کروٹیں اس قدر متلاطم ثابت ہوئیں کہ زندگی کے تمام دھارے بدل گئے اور آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا بس گئی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد، جو اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہوا برصغیر میں ایسا بھونچال آیا کہ مغل شہنشاہیت کا قصر رفعت متزلزل ہو کر رہ گیا اور مغل تہذیب کی جلوہ ریزیاں، جن پر اہل ہند کو ناز ہے، دھندلی پڑنے لگیں۔ حالات ایسے ہمت شکن تھے کہ اس قصر رفعت کی تعمیر جدید ناممکن ہوگئی اور اٹھارہویں صدی کے تمام اہل بصیرت مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ اب ایک ہی صورت باقی تھی یعنی مغل شہنشاہیت کے کھنڈروں پر چھوٹی چھوٹی اکائیاں قائم ہو جاتیں۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے چند سال کے اندر سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے اور تمام ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ جہاں کوئی سورما کھڑا ہوگیا اس نے اپنی نئی سلطنت بنالی۔ سلطنت آصفیہ بھی اسی پرآشوب ماحول کی پیداوار ہے۔

2 آصف جاہی سلطنت کے بانی اور معمار نظام الملک آصف جاہ تھے اور ان کے بعد ان کے آٹھ جانشینوں نے اس سلطنت کو پروان چڑھایا۔ ان سلاطین کی خاص شان یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سلطنت کو ظاہری طمطراق اور شان و شوکت کا طلسم نہیں بنایا۔ بلکہ اس کو بلند پایہ اخلاق اور علم و فضل کا مخزن بنا دیا۔ یہ سلاطین ایک پرعظمت خاندانی پس منظر کے ساتھ دکن آئے تھے۔ اس خاندان کا پس منظر دیکھا جائے تو اس میں علما، فضلا، اور صوفیا کی بڑی شخصیتیں نظر آتی ہیں جو ترکستان کی مسند رشد و ہدایت پر فائز تھیں۔ یہی زریں روایات ہندوستان میں بھی اس خاندان کے ساتھ آگئیں۔ چنانچہ اسی گراں قدر سرمایۂ حیات کے ساتھ ان لوگوں نے ہندوستان اور مغل سلطنت کی خدمت کی۔

نظام الملک اور ان کے باپ دادا کے کارنامے اس قدر درخشاں ہیں کہ زمانہ انھیں کبھی بھول نہیں سکتا نظام الملک کے والد شہاب الدین خاں فیروز جنگ کو ان کی گراں بہا خدمات کی بنا پر شہنشاہ اورنگ زیب نے ان الفاظ میں دعا دی تھی کہ " آبروے او تا روز قیامت خدا نگاہ دارد " شہنشاہ کی یہ دعا آصف جاہی خاندان کے ہمیشہ شامل حال رہی۔ اپنے بزرگوں کے کارناموں کی بدولت آصف جاہی سلاطین افقِ سیاست پر چمکے اور اپنی اولاد اور احفاد کو بساطِ سیاست پر مفتخر ہوتے دیکھا۔

خاندانِ مغلیہ سے وفاداری

آصف جاہی سلاطین کی سب سے پہلی شاندار روایت، جس کو سلطنت کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیے وہ وفاداری تھی جو انھوں نے مغل شہنشاہیت کے ساتھ ظاہر کی۔ نظام الملک نے دکن میں اپنی خود مختار سلطنت تو قائم کر لی تھی جو مغل شہنشاہیت سے علیحدہ تھی لیکن اس خود مختاری کے باوجود مغل شہنشاہیت سے اپنا روایتی رشتہ کبھی منقطع نہیں کیا۔ آصف جاہی سلطنت کی تاسیس اٹھارہویں صدی کے سیاسی تلاطم میں ہوئی تھی اور ان حالات میں یہ تاسیس ناگزیر تھی۔ اگر آصف جاہی سلطنت قائم نہ ہوتی تو مرہٹہ شہنشاہیت قائم ہو جاتی : بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔ لیکن آصف جاہی سلطنت کی تاسیس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی بدولت خود مغل شہنشاہیت کی بہترین روایات محفوظ رہیں۔ کیونکہ اس نئی سلطنت نے اپنے دائرہ عمل میں مغل شہنشاہیت کی عظمت کو محفوظ کر لیا۔ شہنشاہیت تو مٹنے والی تھی اور وہ مٹ کر رہی۔ لیکن نظام الملک نے اپنی نئی سلطنت قائم کر کے مغلوں کے نام کو باقی رکھا اور اس کے تمدنی نقوش کی رکھوالی کی۔ آصف جاہی سلطنت میں مغل شہنشاہوں کا نظم و نسق اور ان کی تمدنی جلوہ ریزیاں ایسی سما گئی تھیں کہ وہ مغل شہنشاہیت کی نقش ثانی معلوم ہوتی تھیں۔

آصف جاہی سلطنت کوئی چھوٹی قلمرو نہ تھی بلکہ بندھیاچل کے پہاڑوں سے لے کر مدور اٹک تمام جزیرہ نمائے ہند پر پھیلی ہوئی تھی اور بجائے خود ایک شہنشاہیت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے تین پایۂ تخت تھے۔ برہانپور دریائے تاپتی پر شمالی پایۂ تخت تھا، اورنگ آباد وسط دکن میں درمیانی اور حیدرآباد جنوبی پایۂ تخت تھے اور تینوں مراکز میں نظام الملک کے دربار منعقد ہوتے تھے اور یہاں مغل شہنشاہیت کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کی وہ عکس ریزیاں ہوتی تھیں کہ آنکھوں کے سامنے ایک تصویر کھنچ جاتی تھی کہ گویا یہ بھی ایک شہنشاہیت ہے۔ آصف جاہی سلطنت کا خاص وصف یہ ہے کہ خود مختاری کے باوجود یہ نئی

سلطنت مغل شہنشاہیت کے ساتھ ایک ایسے مضبوط اخلاقی اور روحانی رشتے میں منسلک تھی کہ وہ کبھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ جب تک مغل شہنشاہ تختِ دہلی پر جلوہ افروز رہے سلاطین آصفیہ بھی پوری عقیدت کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے رہے اور ان کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرتے رہے۔ یہ تاریخی حقیقت بھی بلند پایہ اخلاق کی آئینہ دار ہے کہ نظام الملک دکن میں ایک ذی اختیار حکمراں ہونے کے باوجود اپنے کو کبھی بادشاہ یا سلطان کے لقب سے مزین نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے کو "بندگانِ عالی" یعنے شہنشاہوں کا فرمانبردار اور خادم سمجھتے تھے۔ انھوں نے کبھی تاج و تخت استعمال نہیں کیا بلکہ فرش زمین پر مسند لگا کر بیٹھتے تھے۔ ان کی مسند اورنگ آباد میں اب تک محفوظ ہے، اور ان کے اتباع میں ان کے جانشین بھی مسند ہی پر نشست کرتے رہے۔ شاہی چتر اور تاج و تخت کے استعمال کو وہ مغل شہنشاہوں کے خلاف سوءِ ظن و بے وفائی سے تعبیر کرتے تھے۔ حیدرآباد کے سکے پر برسوں تک اورنگ زیب کا نام ثبت ہوتا رہا۔

یہ وفاداری ظاہرداری تک محدود نہ تھی بلکہ نظام الملک نے ہر آڑے وقت پر اپنے عمل سے بھی اس وفاداری کا پورا ثبوت دیا۔ دکن کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد نظام الملک نے محمد شاہ کو یقین دلایا کہ وہ ہر حالت میں شہنشاہیت سے وابستہ ہیں اور شہنشاہ کی خدمت کے لیے تیار رہیں۔ چنانچہ محمد شاہ کو جب کبھی مشکلات پیش آئیں اور اندرونی اور بیرونی خطرات کا سامنا ہوا نظام الملک شہنشاہ کی امداد کے لیے فوراً دہلی پہنچ گئے اور شہنشاہ کے ہر بلاوے پر لبیک کہا۔ مرہٹوں کے حملے اور نادر شاہ کی یلغار سے مغل شہنشاہیت دو خطرات میں گھر گئی تھی۔ مرہٹوں کا قائد باجی راؤ دہلی کے مضافات تک بڑھ آیا اور تاخت و تاراج کرنے لگا۔ اور نادر شاہ نے اس واقعے کے ایک سال کے اندر ہندوستان پر حملہ کر دیا اور کرنال میں مغل فوجوں کو شکست دے دی۔ نظام الملک نے ان دونوں خطرات کا پُرزور مقابلہ کیا۔ کرنال کی شکست کے بعد نظام الملک نے نادر شاہ سے مدبرانہ گفتگو کی اور پچاس لاکھ تاوانِ جنگ پر مصالحت ہو گئی چنانچہ یہ طے ہوا کہ نادر پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ لے کر ہندوستان سے واپس چلا جائے گا۔ لیکن بعض بے وفا اور عاقبت نااندیش عہدہ داروں کی سازش سے مصالحت پر پانی پھر گیا۔ نادر کو زرِ کثیر کی لالچ دی گئی اور اب وہ پچاس لاکھ پر کیسے قناعت کرتا۔ وہ دہلی پہنچ گیا اور دہلی میں ایک قیامت خیز

ہنگامہ برپا ہوگیا۔ یہ ۱۷۳۹ء کا واقعہ ہے۔ ہندوستانیوں اور ایرانیوں میں جو جھڑپ ہوئی تو نادر نے تلوار کھینچ لی اور دہلی میں قتل عام شروع ہوگیا۔ اس آشوب میں ہزاروں آدمی مارے گئے اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اس نازک موقعے پر بھی نظام الملک نے ہی اقدام کیا اور ان کے بروقت اقدام سے قتل عام بند ہوا۔ اس وقت نظام الملک کے سوا کوئی اور مدبر نہیں تھا جو اس خطرے کا مقابلہ کرتا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ نظام الملک نے ہی نادر شاہ کے سامنے، جب کہ وہ برہنہ شمشیر لیے ہوئے مسجد میں بیٹھا تھا اور قتل عام ہو رہا تھا، یہ شعر پڑھا تھا:

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی   مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اس جرأت مندانہ اقدام سے نادر شاہ نے "بہ ریش سفیدت بخشیدم" کہہ کر تلوار میان میں کر لی اور قتل عام بند ہوا۔ نظام الملک جب تک زندہ رہے وفاداری سے کبھی دریغ نہیں کیا، اور اپنے بستر مرگ پر اپنے جانشین ناصر جنگ کو جو وصیت کی تھی اس میں وفاداری کی تلقین تھی اور وفاداری کی روشن روایت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا کیونکہ نظام الملک نے اپنی آخری ساعتوں میں بہت اہم وصیتیں کی تھیں جن میں سیاست کے زریں اصول شامل ہیں، اور ان وصایا میں وفا شعارانہ عقیدت بھی تھی جو مغل شہنشاہیت کے ساتھ وابستہ تھی[۲]۔ اس وصیت کی ان کے جانشینوں نے پوری پابندی کی۔

رعایا پروری

آصف جاہیوں کی اور بہترین روایات میں رعایا پروری، مذہبی رواداری اور معارف نوازی کا بڑا عنصر ہے۔ سلاطین آصفیہ بہت روادار اور رعایا پرور تھے۔ انھوں نے اپنی رعایا کی نہ صرف ہر مصیبت میں خواہ وہ انسانی ہو یا آسمانی، مدد کی بلکہ فلاح و بہبود اور دینی و اخلاقی تزئین کا بھی سامان کیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آصف جاہی فرماں رواؤں نے اپنی سلطنت کا نظم و نسق ایسا مرتب کیا تھا کہ اس کے تمام کل و پرزے، رعایا کے فلاحی اغراض میں گھومتے تھے اور نظم و نسق کا اولین مقصد رعایا کی فلاح بہبود تھا۔ حقیقت یہ [illegible] حکومت خواہ وہ کسی خطۂ ارض میں کیوں نہ ہو، ایسی ہونی چاہیے کہ ایک طرف وہ ملک کے تمام قدرتی ذرائع سے پورا فائدہ اٹھائے اور ملک کو ایک طاقت ور اور متمدن مملکت بنائے اور دوسری طرف افراد مملکت کی ذہنی و اخلاقی تزئین کے تمام ضروری سامان مہیا کرے تاکہ ان کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوں اور وہ ایک زندہ قوم کی شان میں اجاگر ہوں۔ آج یہی مقصد

ہر نظام مملکت کے سامنے ہوتا ہے۔ ہر مملکت یہ چاہتی ہے کہ افراد مملکت کے حقوق جان و مال کی نگہداشت کے ساتھ ان کی ذہنی و اخلاقی ترقی کا انتظام کرے اور ان کی معاشی حالت ایسی متوازن بنائے کہ ہر فرد اپنے کنبے کے ساتھ خوش حال زندگی بسر کر سکے۔ سلطنت آصفیہ کی دو سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ اس طویل زمانے میں سلاطین آصفیہ نے رعایا پروری کے بہترین نمونے چھوڑے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں حیدرآباد میں رودِ موسیٰ کے غیر معمولی بہاؤ سے ایک خوفناک سیلاب آگیا اور یہ اس قدر تباہ کن تھا کہ اس کی وجہ سے آدھا شہر بہہ گیا اور ہزاروں شہری بے خانماں ہو گئے۔ فرماں روائے وقت نے ان مصیبت زدوں کی جس قدر دستگیری کی وہ رعایا پروری کی ایک روشن مثال ہے۔ یہ میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا عہد حکومت تھا۔ ان کی سیر چشمی اور داد و دہش اس قدر وسیع تھی کہ وہ تاریخ حیدرآباد میں ایک ضرب المثل ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ اپنی رعایا کی معمولی تکلیف گوارا نہیں کرتے تھے۔ جب کبھی رعایا کو تکلیف پہنچتی وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کے اس شعر سے ان کی رعایا پروری اور انسانی ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

یہ صرف الفاظ ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ان کے حقیقی عمل کا آئینہ ہیں۔ موسیٰ ندی کے سیلاب سے وہ اس قدر دلگیر ہوئے کہ سیلاب زدہ بے گھروں کے لیے اپنے تمام محلات کے دروازے کھول دیئے اور جب تک ان مصیبت زدوں کے مکان تیار نہیں ہوئے یہ سب شاہی محلات میں چین کی زندگی بسر کرتے رہے اور شاہی باورچی خانے سے، جس کو حیدرآباد میں میز خانہ کہتے ہیں، ان پناہ گزینوں کو کھانا دیا جاتا تھا، اور ان لوگوں کو کھانا پکانے تک کی زحمت نہیں ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے علیحدہ اور ہندوؤں کے لیے علیحدہ کھانا تیار ہوتا تھا اور اس شاہی مہمان نوازی میں تمام طبقات کی روایات اور معتقدات کا پورا لحاظ تھا۔ ان سب بے گھروں کو تعمیر مکان کے لیے خزانہ شاہی سے رقمیں دی گئیں تاکہ یہ لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنے مکان تعمیر کرلیں اور چین کی زندگی بسر کریں۔

مذہبی رواداری

دوسری روایت سلاطین آصفیہ کی مذہبی رواداری ہے۔ ان سلاطین نے اپنے غیر مسلم

طبقات کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیا۔ وہ ان کا خاص سرمایۂ حیات ہے۔ ان سلاطین کی حکمرانی دکن جیسے ایک وسیع ملک میں کارفرما تھی۔ دکن تین خطوں میں بٹا ہوا ہے اور یہ خطے مرہٹواڑہ، کرناٹک اور تلنگانہ کہلاتے ہیں۔ یہ تینوں خطے اپنے جغرافیہ، آب و ہوا اور لسانی اور تمدنی اختلافات کی بناپر ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز تھے۔ ان تمام خطوں میں ہندو آبادی کی کثرت تھی، اور مسلمان جو حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۱۲ فی صدی سے زیادہ نہ تھے۔ اس مختلف المنوع ملک پر حکومت کرنا جہاں غیر مسلم ۹۰ فی صدی کے لگ بھگ ہوں اور مسلمان صرف ۱۲ فی صدی تھے، آسان نہ تھا۔ لیکن یہ آصف جاہیوں کا طرۂ امتیاز ہے کہ انھوں نے یہاں حکومت کا پوراحق ادا کیا۔ ان کی رعایا پروری میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی۔ اس رواداری کی بنیاد خود نظام الملک آصف جاہ نے رکھی تھی جو اس سلطنت کے بانی تھے، اور ان کی زریں روایت دکن میں صدیوں تک قائم رہی، اور ان کے تمام جانشینوں نے اپنے مورث اعلیٰ کی پوری پیروی کی۔ نظام الملک کا مسلک رواداری خود ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی ہندو رعایا کے مذہبی مسائل سلجھاتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "رئیس کل را تعصب دین و مذہب خوب نیست زیرا کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین است"[۱۳] یہ نظام الملک کے وہ زریں الفاظ ہیں جن سے ان کا حقیقی مسلک واضح ہوتا ہے اور اسی پر سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، اور اسی پر وہ عمل کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح افضال الٰہی کے پرتو امیر، غریب، ہندو، مسلمان، گبر و ترسا جیسے تمام طبقات عالم پر محیط ہیں، فرمانروائے وقت کا دامن عاطفت بھی اسی طرح وسیع ہونا چاہیے۔ نظام الملک نے بستر مرگ پر بھی اپنے جانشین ناصر جنگ کو اس رواداری کی پُر زور الفاظ میں تلقین کی تھی۔ انھوں نے اپنے چوبیس سالہ عہد حکومت میں اسی مسلک کی پابندی کی اور اپنے ہندو عہدہ داروں پر پورا اعتماد کیا۔ چنانچہ لالہ منسارام ان کے معتمد علیہ پیش کار یعنی پرائیویٹ سیکریٹری تھا جو پنجاب کا کھتری تھا اور اسی سے وہ پورا کام لیتے تھے۔ لالہ منسا رام نے بھی جس وفاداری اور دل سوزی سے اپنے آقا کی خدمت کی اور نظم و نسق کو سلجھایا وہ تعریف سے خالی نہیں ہے۔ جس طرح اس نے وفاداری کی اسی طرح اس کی عزت افزائی کی گئی۔ منسارام کی مرتبہ تاریخوں سے جو ماثر نظامی اور دربار آصف کے نام سے مشہور ہیں ان حقائق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ لالہ منسا رام نے دربار آصف

ہیں نظام الملک کے تمام ضوابط جمع کر دیے ہیں جو انھوں نے دکن کے نظم و نسق اور سیاسی رہبری کے لیے وضع کیے تھے۔ ان ضابطوں سے جو تعداد میں ستّر ہیں، ان کی سیاسی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ پورن چند ان کا دیوان اور رام سنگھ ان کی بیٹی کا منشی تھا۔ اول الذکر کی انھوں نے خاص الفاظ میں تعریف کی تھی اور اس کو وہ عہد اکبری کے دیوان ٹوڈرمل کا مثنیٰ کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ شہنشاہ اکبر نے ٹوڈرمل کو دیوان بنا کر اطمینان حاصل کیا تھا اور مجھے بھی پورن چند کی دیوانی سے دلی تسکین اور اطمینان ہے۔ اور پورن کی یہ تعریف اس کے لیے فخر و مباہات کا سرمایہ تھا۔

نظام الملک کے جانشینوں نے اپنے مورث اعلیٰ کی سنہری روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نظام الملک کے بعد ان کے آٹھ جانشینوں نے دکن کی بساط سیاست کو مزین کیا اور ہر عہد میں رواداری کی سنہری مثالیں چھوڑیں۔ سلطنت کے نظم و نسق میں ہندو حکام بھی ایسے شریک تھے جیسے کہ مسلمان تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں راجہ جپیت رام، رام بخش، گوبند بخش اور چندو لال جیسے سربرآوردہ ہندو سلطنت آصفیہ کے وزرا ہوئے ہیں۔ آخر الذکر چندو لال نے ۱۸۰۸ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک تقریباً چالیس سال سلطنت آصفیہ کی اس زور سے سیاسی رہبری کی کہ وہ بجائے خود فرمانروائے وقت معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس چالیس سال کے دوران میں لوگ حیدرآباد کو چندو لال کا حیدرآباد کہتے تھے۔ بیسویں صدی میں مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم ہوئے تو ایک نئی شان پیدا ہوئی۔ مہاراجہ کی شاہ پرستی اور وفاداری اب بھی حیدرآباد میں زبان زد خاص و عام ہے۔ وہ نہ صرف ایک پیکر اخلاق تھے بلکہ سلطنت اور شاہی خاندان کے سچے بہی خواہ اور وفادار تھے اور حیدرآباد کے وزرا میں مہاراجہ کشن پرشاد کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اب رہی عام رعایا تو وہ بھی سلاطین آصفیہ کے سایہ عاطفت میں اس قدر آسودہ حال تھی کہ اس کی مثال نہیں۔ سلطنت میں ہندوؤں کے تمام رسم و رواج، عبادات اس قدر محفوظ تھے کہ وہ خود ان کی حکومت معلوم ہوتی تھی۔ ہندوؤں کے تمام طبقے اپنے عبادات اور تہوار پوری آزادی سے مناتے تھے اور اس میں حکومت اور عوام کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ ملک میں جس قدر مساجد تھیں ان سے بہت زیادہ منادر بھی تھے۔ حکومت کی طرف سے بڑے منادر کے رسوم و امداد بھی مقرر تھیں۔ بعض منادر کے مصارف کے لیے زمینیں اور جاگیریں وقف تھیں۔ قدیم منادر مثلاً دیول ہزار ستون ورنگل، دیول رامپا، پاکھال اور ایلورا، اور

ایجنسی کے عجائبات کی حکومت خود نگرانی کرتی تھی اور نگہداشت و حفاظت پر لاکھوں روپے خرچ کرتی تھی۔ یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ہندو اوقاف کے علاوہ بعض اسلامی اوقاف بھی ہندوؤں کی نگرانی میں تھے اور ہندو دیسمکھ، پٹیل اور پٹواری، بعض مساجد اور دوسرے اسلامی ادارات کی نگہداشت کرتے تھے اور اس قدر دلسوزی سے کرتے تھے کہ کبھی مسلمانوں کو ان کی نگہداشت سے متعلق کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی رواداری کا اثر تھا کہ ہندو رعایا سلطنت آصفیہ کو اپنی قومی سلطنت اور سلاطین کو اپنا قومی بادشاہ سمجھتے تھے اور تاج و تخت سے انھیں دلی محبت تھی۔ ملک کے اکثر ہندو طبقات ایسے تھے جو اسلامی طرز معاشرت اور رسم و رواج میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کھتری، کائستھ، اور دوسرے طبقے مسلمانوں کی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے اور ان کے گھروں کی نشست و برخاست، اوڑھنا، بچھونا، کھانا پینا بالکل مسلمانوں کا عکس تھا اور مسلمانوں اور ان ہندو طبقات میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا تھا۔

علمی سرپرستی

معارف نوازی اور علمی سرپرستی بھی سلطنت آصفیہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ تمام سلاطین نظام الملک سے لے کر آخر تک علم دوست اور علم کے سچے قدردان و سرپرست تھے۔ سب سلاطین تعلیم یافتہ و علمی شغف سے سرشار تھے۔ یہ سلاطین دکن میں ایک بڑے تمدنی اور علمی سرمائے کے ساتھ آئے تھے۔ نظام الملک اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور کبھی شاکر اور کبھی آصف تخلص کرتے تھے۔ اپنے علمی شغف کو وہ تمام ملک میں پھیلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اورنگ آباد میں جو ان کا پایۂ تخت تھا، علما اور علمی درسگاہوں کی خود سرپرستی کرتے تھے۔ وہ طلبہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور اپنی فیاضانہ داد و دہش سے ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ مدارس کے طلبہ کو اپنے سامنے بلا کر ان سے ان کی تعلیم اور درسیات سے متعلق سوال کرتے اور ان کے شافی جواب پر اشرفی عطا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ ان کے عہد میں دکن علم و فن کا گہوارہ ہو گیا۔ طالب علم پورے شوق سے حصول علم کرتے تھے اور علما اپنی تصانیف سے علمی ذخیرے میں اضافہ کرتے تھے۔ چنانچہ لالہ منسارام نے مآثر نظامی، منعم خاں نے سوانح دکن اور یوسف محمد خاں نے تاریخ منتخبہ جیسی بڑی تاریخیں مرتب کی ہیں جو آصف جاہی تاریخ کے بڑے ماخذ ہیں۔ نظام الملک کے جانشین نظام علی خاں

آصف جاہ ثانی کے عہد میں علامہ آزاد بلگرامی، صمصام الدولہ شاہنواز خاں اور لچھمی نارائن شفیق جیسے علما منظر عام پر آئے۔ ان علما کی بلند پایہ تصانیف اس زمانے کے علمی شغف کی نشاندہی کرتی ہیں۔ غلام علی آزاد کا خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، سبحۃ المرجان، صمصام الدولہ کی مآثر الامرا، اور لچھمی نارائن شفیق کی مآثر آصفی، گل رعنا، چمنستان شعرا، بساط الغنائم، آصف جاہی دور کی بہت بڑی علمی یادگاریں ہیں۔

انیسویں صدی میں جب کہ حیدرآباد میں مدرسہ فخریہ اور دارالعلوم جیسی بڑی درس گاہیں قائم ہوگئیں تو علم و فن کی کتب کے انبار لگ گئے اور لاتعداد کتابیں تصنیف ہوگئیں۔ چنانچہ ایک صدی کے دوران میں جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں وہ شمار سے باہر ہیں۔ معمولی تخمینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذخیرۂ علم بیس یا بائیس ہزار کتابوں سے کم نہیں ہے۔ ان اہل تصنیف کی فہرست میں نواب ضیا یار جنگ، انوار اللہ خاں، فضیلت جنگ، مولانا عبدالقدیر صدیقی، حضرت شاہ عبداللہ صاحب، غلام علی موسوی، جمال الدین نوری، مولانا احمد حسین امجد، محمد مرتضیٰ، عزیز جنگ، عبدالجبار خاں، سید علی بلگرامی اور عماد الملک جیسے علما و مؤرخ شامل ہیں۔ یہ تو یہاں کی اندرونی سرگرمی تھی لیکن آصف جاہی سلطنت اپنی قلمرو سے باہر بھی تمام ہندوستان کی علمی سرپرستی کرتی رہی۔ ہندوستان کے تمام علمی اداروں اور علما کی اس قدر سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی کہ گویا وہ خود حیدرآباد کے ادارے ہیں۔ جامعہ علیگڑھ کی تعمیر میں حیدرآباد کا جو حصہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سالار جنگ اول نے سر سید احمد خاں کی تعلیمی مہم میں اور کالج کی تاسیس میں جس قدر تعاون کیا وہ تاریخ علیگڑھ کا ایک نمایاں باب ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں حیدرآباد سے علیگڑھ کی لاکھوں روپوں سے مدد کی گئی۔ اس کے علاوہ جامعہ دیوبند دارالمصنفین اعظم گڑھ، دارالندوہ لکھنو، حمایت اسلام لاہور، جیسے بڑے ادارات بھی حیدرآباد کی معارف نوازی سے فیض یاب ہوئے۔ ان ادارات کی تصانیف حیدرآباد کی امداد سے لکھی گئیں اور شائع ہوئیں۔ علامہ شبلی، مولانا حالی، عبدالحلیم شرر، سید سلیمان ندوی جیسی بڑی شخصیتیں حیدرآباد کی معارف نوازی سے سرفراز ہوئیں۔ علامہ شبلی کی اکثر کتابیں حیدرآباد کی امداد سے شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان کا کوئی ادارہ اور عالم و شاعر ایسا نہیں ہے جو حیدرآباد کی قدردانی سے محروم رہا ہو۔ مولانا حالی نے حیدرآباد کی امداد سے ہی اپنی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور اردو ادب کو مالامال کیا۔ ورنہ انھیں اپنی خود بسری کے لیے نوکری کرنی پڑتی تھی۔ صرف آصف جاہ نے

جو ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۳ء تک حیدر آباد کے وزیر اعظم رہے، مولانا حالی کے نام سو روپے وظیفہ جاری کیا تھا۔ چنانچہ مولانا اس امداد کی بدولت اطمینان سے اپنے علمی مشاغل میں منہمک رہے۔ اور ذیل کے اشعار میں آسماں جاہ کا شکریہ ادا کیا تھا:

آسماں جاہ کی خدمت میں ہے حالی کی یہ عرض — کہ اگر میرا ہر ایک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اس کا کہ سبھے گھر بیٹھے — اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

حوالے:

۱۔ خافی خاں، جلد دوم۔	۳۔ ایضاً، ص ۵۹
۲۔ دربار آصف، لالہ منسا رام، ص ۶۷	۴۔ ایضاً، ص ۵۸-۵۹

اسلام اور چند معاشی مسائل

سید یعقوب شاہ

اس کتاب کے مصنف مالیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے ربوٰ، زکوٰۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم معاشی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور کتاب و سنت، تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائج فکر شستہ اور سلیس انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

قیمت عام ایڈیشن ۵ روپے — عمدہ ایڈیشن ۶/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: سیکرٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور